Translation Samvaad, Volume 2, Issue 2, December 2025
ISSN: 3049-4494

جیلانی بانو کی افسانہ نگاری

ڈاکٹر فرحت شمیم

ایسو سی ایٹ پروفیسر

شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی

فون نمبر - 9152290860

جیلانی بانو نے اردو میں افسانہ نگاری کا آغاز 1953 سے کیا۔ ان کی پہلی کہانی "ایک نظر ادھر بھی" 1952 میں ادب لطیف میں شائع ہوئی اور دیگر کہانیاں سویرا اور افکار میں شائع ہوئیں۔جیلانی بانو کے افسانوی مجموعے راستہ بند ہے، روشنی کے مینار، نروان، پرایا گھر، بات پھولوں کی، سچ کے سوا کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کے دونوں ناول "ایوان غزل" اور "بارش سنگ" بھی بہت کامیاب ناول ہیں۔ جیلانی بانو ایک ترقی پسند ادیبہ تھیں۔ انھوں نے زندگی کا مطالعہ و مشاہدہ بڑے قریب سے کیا ہے اور اپنے دور میں پیش آنے والے سیاسی و سماجی مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے کی مسلسل کوشش کی ہے۔ ترقی پسندی سے وابستگی نے انھیں طبقاتی استحصال اور غریب مجبور اور پسماندہ طبقے کے لوگوں سے ایک طرح کی ہمدردی پیدا کر دی تھی۔

جیلانی بانو نے جب اپنا ادبی سفر شروع کیا اس وقت ملک تقسیم ہو چکا تھا۔ آزادی کے بعد ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر پہنچ کر آہستہ آہستہ زوال کی طرف گامزن تھی۔ اس وقت سماج اور معاشرے میں ہر طرف واہی تباہی مچی ہوئی تھی۔اورسیاسی و معاشی بحران کا اثر زندگی کے ہر شعبے میں پڑا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت کے شاعر و ادیب بھی اس سے بہت متاثر ہوئے۔ ادب پر ایک طرح کا جمود طاری ہو گیا۔ایسے ہی حالات میں جیلانی بانو نے اپنا ادبی سفر شروع کیا۔ جس کے بارے میں وہ خود ہی لکھتی ہیں:

> "جب میں نے لکھنا شروع کیا تو ادب میں موضوع کچھ کم سے ہو گئے تھے یعنی وہ ایک خاص فضا نہیں
> تھی جب موضوع کا مینا برستا ہے افسانہ نگاروں اور شاعروں کی بن آتی ہے۔ دوسری جنگ عظیم،
> 1947 کا تہلکہ، حیدر آباد کا پولیس ایکشن اور تلنگانہ کے نعرے اب ہر طرف سناٹا چھا رہا تھا۔"

(جیلانی بانو، تین لکیریں، افسانوی مجموعہ "روشنی کے مینار" نیا ادارہ، لاہور1958، ص،9)

یہی وہ زمانہ تھا جب بیشتر ادیب و شاعر کسی نہ کسی حد تک ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے اور اپنی تخلیقات میں اس وقت کے حالات اور خارجی مسائل پیش کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اس وقت کے حالات کا اثر جیلانی بانو کی ادبی شخصیت اور ان کے فن پارے میں بھی جھلکتا ہے۔ ان کی ابتدائی دور کی کہانیوں میں اشتراکی رومانیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان افسانوں میں "روشنی کا مینار"، "بھنور اور چراغ" اور "آگ اور پھول" ہیں۔ جیلانی بانو کے ان افسانوں میں اس عہد کا سیاسی شعور نیز اس زمانے کی معاشرتی و سماجی

زندگی کا عکس دلکش رومانی پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ مصنفہ نے ان کہانیوں میں کردار کے حوالے سے خارجی زندگی کے واقعات و حالات اور ساتھ ہی ساتھ کردار کے داخلی احساسات کی بھی ترجمانی کی ہے۔

جیلانی بانو نے اپنا ادبی سفر آزادی کے بعد شروع کیا تھا۔ آزادی کے بعد ملک کے سیاسی حالات کو بہتر بنانے کے لیے ریاست اندھرا پردیش میں تلنگانہ تحریک چل رہی تھی۔ اس تحریک کا مقصد ہندوستان میں اشتراکی نظام قائم کرنا تھا۔ اسے ماحول میں جیلانی بانو نے بھی اشتراکی نظام کی حمایت کی۔ انھوں نے تقسیم کے بعد مسلمانوں کے معاشی، تہذیبی اور معاشرتی زبوں حالی کو نہ صرف دیکھا بلکہ محسوس بھی کیا۔ اس لیے موجودہ نظام زندگی کے خلاف تھیں۔ اس بات کا اعتراف انھوں نے خود ہی کیا ہے:

> ”اپنے پیچھے روایتوں کے جھلملاتے چراغوں کی ایک لمبی کڑی مجھے دکھائی دیتی ہے۔ جس نے مجھے لکھنا سکھایا۔ اپنے دیش کی ان ساری خوبصورت اور نا قابل یقین روایتوں پر مجھے یقین بھی ہے اور فخر بھی۔ جہاں سانپوں کو دودھ پلایا جاتا ہے۔ جہاں ہر قدم پر مندر ہے اور ہر محلہ میں درگا ہیں۔ جہاں گائے کو ماں کہتے ہیں اور دیپک راگ سے آگ لگا دتے ہیں۔ اگر میں زیادہ غور سے دیکھوں تو میری افسانہ نگاری پر ان آریاؤں کی بھی چھاپ ہے جو نگر نگر علم و تہذیب کے چراغ جلاتے پھرتے۔ ایران و عجم کی ثقافت بھی میرے خون کا جزو ہے۔ جو میرے آبا و اجدادا اپنے ساتھ لائے تھے۔ اپنے پیچھے جانے پہچانے چہروں کا ہجوم ہے اور ارجن و کرشن، کالی داس، غالب سر اقبال، ٹیگور اور فیض یہ الگ الگ رنگوں کے پھول ایک جگہ کھلے ہیں اور ان سب رنگوں کی چوٹ میرے ذہن میں پڑرہی ہے۔ میں نے ان سبھوں کو پڑھنے کی کوشش کی ہے۔ کتابیں بھی چہرے بھی اپنے آس پاس کی فضا میں بھی اور وہ تحریریں بھی جو لکھی نہیں جاتیں۔“
>
> (جیلانی بانو، تین لکیریں، افسانوی مجموعہ ”روشنی کے مینار“، نیا ادارہ، لاہور1958، ص13)

جیلانی بانو کی فکر میں ایک سماجی مقصد پوشیدہ ہوتا ہے۔ ان کی تحریروں میں فکری میلانات کی نشان دہی ملتی ہے۔ وہ مشترکہ تہذیب کی علمبردار تھیں۔ وہ ایک اسے دور کی افسانہ نگار ہیں جب پرانے اخلاقی اقدار کی جڑیں کمزور ہو رہی تھیں۔ آزادی کے بعد یہاں پر جاگیردارانہ نظام ختم ہو چکا تھا۔ ایک نئے نظام کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ جاگیرداری نظام کی قدریں اب مٹنے لگی تھیں۔ جیلانی بانو نے اپنے عہد کے نشیب و فراز کا گہرائی سے مشاہدہ کیا اور سماج اور معاشرے کی بدلتی صورت حال کو اپنی تخلیقی بصیرت کے سہارے ادب میں نمایاں کرنے کی سعی کی۔ وہ اس حقیقت سے واقف تھیں کہ ادب کے ذریعے انسان اور سماج کو سدھارا جا سکتا ہے اور ان کے مسائل حل کیے جاسکتے ہیں اور ادب کو انسانی زندگی کی بہتری کا ذریعہ بنایا جاسکتا ہے۔ جیلانی بانو کا رجحان اشتراکیت کی طرف تھا جس کی بنا پر موجودہ نظام سے جد و جہد کرتی نظر آتی ہیں۔ وہ زندگی سے لڑنے کا جذبہ عزم و استقلال جیسی خوبیوں کو دوسروں کے اندر پیدا بھی کرنا چاہتی تھیں۔ ڈاکٹر رشِ اختر اپنی کتاب ”عدسہ“ میں جیلانی بانو کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> ”جیلانی بانو کے ذہن پر فرائڈ کا اثر نہیں۔ وہ جنس کے دلدل میں بھی نہیں پھنستیں۔ ان کی گھر کی بنیاد انسان سے محبت کرنے کا فلسفہ ہے۔ بکھرے ہوئے رشتے کو سمیٹنے کا اصول ہے۔ ارتقا اور فطرت کو قابو میں کرنے کی سائنس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی فکر پر اداسیت اور مجہولیت، رومانیت کی لکیریں نہیں ملتی۔“

(ڈاکٹرش۔ اختر، "عدسہ" کلچرل اکیڈمی گیا، ص75)

جیسا کہ اقتباس میں کہا گیا ہے کہ جیلانی بانو کی فکر پر اداسیت اور مجہول رومانیت کی لکیریں نہیں ملتی بلکہ ان کی فکر کے پیچھے ایک سماجی مقصد چھپا ہوا ہے اور وہ مقصد ہے انسان دوستی کا، فلاح و بہبود کا۔ اس لیے ان کے تمام افسانے ایک سماجی مقصدیت کے تحت لکھے گئے ہیں۔ انھیں ہمیشہ یہی فکر لاحق رہی کہ دنیا کے تمام لوگ امن اور حفاظت کے حصار میں کیسے رہیں۔ وہ "روشنی کے مینار" ہوں یا "موم کی مریم"، "دیوداسی" ہو یا "بہار کے سچ" سبھی تحریروں میں یہی مقصد پوشیدہ ہے۔ ان کا فن دوسری افسانہ نگار خواتین کی طرح مختلف رجحانات کی منزلوں سے گزرتا ہوا سماجی حقیقت نگاری کی طرف گامزن ہوا۔ ان کے افسانوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم میں افسانوں کے وہ واقعات ہیں جن پر رومانیت کی دبیز تہہ جمی ہوئی ہے۔ ان میں داخلیت کی شدت ملتی ہے۔ ان میں دردو غم کی لہریں چھپی ہوئی ہیں۔ خوابوں اور خیالوں کے سہارے زندہ رہنے والے افراد ملتے ہیں۔ شوخ شریر لڑکوں کے قہقہے اور ان کی سسکیاں ہیں۔ اس طرح کے افسانوں میں "موم کی مریم، دیوداسی، بھنور اور چراغ، فصل گل جو یاد آئی، بہاروں کے بیچ ایک انار، نئی عورت، آگ اور پھول، پیاسی چڑیا، کہاں ہے منزل، راہ تمنا، روشنی کے مینار، قابل ذکر ہیں۔ دوسری قسم ان کے افسانوں کی سماجی حقیقت نگاری کی ہے وہ افسانے جو سماجی حقیقت نگاری کے دائرے میں آتے ہیں یہ ہیں۔ آئینہ، ڈریم لینڈ، پنچوں کی رائے، چھٹکارا، چھمیا، تلچھٹ، ستی ساوتری، چوری کا مال، نروان، رات کے مسافر وغیرہ۔

Translation Samvaad, Volume 2, Issue 2, December 2025
ISSN: 3049-4494

English

The Short Stories of Jeelani Bano

Dr. Farhat Shamim

Associate Professor

Department of Urdu, University of Jammu

Phone No.: 90860 91522

Jeelani Bano began her journey in Urdu short story writing in 1953. Her first story, “Ek Nazar Idhar Bhi” (One Look This Way Too), was published in Adab-e-Latif in 1952, while her other stories appeared in renowned literary journals such as Savera and Afkar. Her short story collections Rasta Band Hai, Roshni Ke Minar, Nirvan, Paraya Ghar, Baat Phoolon Ki, and Sach Ke Siwa gained immense popularity. Her two novels, Ewan-e-Ghazal and Barish Sang, were also highly successful.

Jeelani Bano was a progressive writer. She observed and studied life very closely and made continuous efforts to understand and address the political and social problems of her time. Her association with the Progressive Writers’ Movement instilled in her a deep sense of sympathy for the poor, oppressed, and marginalized sections of society, as well as a strong awareness of class exploitation.

When Jeelani Bano began her literary career, the country had already undergone Partition. After independence, the Progressive Movement, having reached its peak, was gradually moving towards decline. Society was engulfed in chaos and destruction, and political and economic crises affected every sphere of life. As a result, writers and poets of the time were deeply influenced, and a sense of stagnation prevailed in literature. It was under such circumstances that Jeelani Bano began her literary journey. She herself writes:

“When I began writing, there were very few themes left in literature; that vibrant atmosphere, where themes shower like rain and provide abundance to storytellers and poets, no longer existed. The Second World War, the upheaval of 1947, the police action in Hyderabad, and the slogans of Telangana—after all this, silence had spread everywhere.”

(Jeelani Bano, Teen Lakeeren, in the short story collection Roshni Ke Minar, Naya Idara, Lahore, 1958, p. 9)

This was the period when most writers and poets were, to some extent, influenced by the Progressive Movement and considered it their duty to reflect contemporary conditions and external realities in their creative works. The impact of these circumstances is clearly visible in Jeelani Bano’s literary personality and creations as

well. Her early stories exhibit traces of socialist romanticism. Notable among these are Roshni Ka Minar, Bhanwar Aur Chiragh, and Aag Aur Phool. In these stories, the political consciousness of the era and the social and cultural life of the time are portrayed in an appealing romantic style. Along with depicting external events and conditions, the writer also presents the inner emotions and psychological states of her characters. Jeelani Bano began her literary career after independence. In the post-independence period, the Telangana Movement was underway in the state of Andhra Pradesh with the aim of establishing a socialist system in India. In such an environment, Jeelani Bano also supported the socialist ideology. She not only witnessed but deeply felt the economic, cultural, and social deterioration of Muslims after Partition, which led her to oppose the prevailing system of life.

She herself acknowledges this:

"Behind me, I see a long chain of flickering lamps of tradition that taught me how to write. I have faith in and pride over all the beautiful and incredible traditions of my country—where snakes are fed milk, where there is a temple at every step and a Durga in every neighborhood, where the cow is called mother and fire is ignited through Raga Deepak. If I look more closely, I find the imprint of those Aryans on my short stories who wandered from town to town lighting lamps of knowledge and culture. The culture of Iran and Ajam is also a part of my blood, brought along by my ancestors. Behind me stands a crowd of familiar faces, and Arjuna and Krishna, Kalidas, Ghalib, Sir Iqbal, Tagore, and Faiz—flowers of different colors blooming together, all leaving their impression on my mind. I tried to read them all—books, faces, the atmosphere around me, and even those writings which are never written."

(Jeelani Bano, Teen Lakeeren, Roshni Ke Minar, Naya Idara, Lahore, 1958, p. 13)

A social purpose lies embedded in Jeelani Bano's thought. Her writings clearly indicate her intellectual inclinations, and she emerges as a proponent of composite culture. She belongs to an era when traditional moral values were weakening. After independence, the feudal system had been abolished, and the foundation of a new system had been laid. The values of feudalism were gradually fading away. Jeelani Bano deeply observed the ups and downs of her time and attempted to highlight the changing social reality through her creative insight. She firmly believed that literature could reform individuals and society, solve their problems, and serve as a means for the betterment of human life. Her inclination towards socialism made her appear engaged in a constant struggle against the existing system. She also wished to instill qualities such as determination, perseverance, and the courage to struggle against life in others. Dr. Sh. Akhtar writes about Jeelani Bano in his book Adsa:

"Jeelani Bano's mind is not influenced by Freud, nor does she sink into the mire of sexuality. The foundation of her art is the philosophy of love for humanity, the principle of restoring fragmented relationships, and the science of evolution and controlling nature. This is why traces of melancholy, ambiguity, or romantic escapism are not found in her thought."

ISSN: 3049-4494

(Dr. Sh. Akhtar, Adsa, Cultural Academy, Gaya, p. 75) As stated in the above quotation, Jeelani Bano's thought is free from sadness and vague romanticism; rather, it is driven by a clear social purpose—humanism, welfare, and collective well-being. Therefore, all her short stories are written with a strong sense of social commitment. She was constantly concerned with how people across the world could live within an environment of peace and security. Whether it is Roshni Ke Minar, Mom Ki Maryam, Devdasi, or Bahar Ke Sach, the same underlying objective is evident in all her works.

Like other women short story writers, her art passed through various phases and ultimately moved towards social realism. Her short stories can be broadly classified into two categories. The first category includes stories layered with dense romanticism, marked by intense subjectivity, hidden waves of sorrow and pain, dreamers who survive on imagination, the laughter and sobs of mischievous youth. Notable stories of this type include Mom Ki Maryam,

Devdasi, Bhanwar Aur Chiragh, Fasl-e-Gul Jo Yaad Aayi, Baharon Ke Beech Ek Anar, Nayi Aurat, Aag Aur Phool, Pyasi Chidiya, Kahan Hai Manzil, Rah-e-Tamanna, and Roshni Ke Minar.

The second category comprises stories rooted in social realism. These include Aaina, Dream Land, Panchon Ki Rai, Chhutkara, Chhamiya, Talchhat, Sati Savitri, Chori Ka Maal, Nirvan, and Raat Ke Musafir, among others.